پروفیسر خالد شبیر احمد

مغنیٔ آتش نفس

بعض شخصیتیں دنیا سے اٹھ جاتی ہیں مگر دل و دماغ پر ایسے گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہیں جو تا دم آخر منور رہتے ہیں۔ جانشین امیر شریعت سید ابو معاویہ ابوذر حسنی بخاری رحمہ اللہ بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہے کہ جن کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ مجھے ان کی محبت کی گرفت میں لئے رکھتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے تو اٹھ گئے ہیں مگر میرے دل کی دنیا پر ابھی تک انہی کی ہی فرمانروائی ہے۔ وہ بلاشبہ ایسی شخصیت تھے جو قدرت کی طرف سے ہم سب کے لئے ایک نعمت تھی۔ ایک ہمہ گیر ہمہ جہت شخصیت، جس کے نہ جانے کتنے پہلو اور جہتیں ہیں۔ ہر پہلو اور ہر جہت میں انفرادیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ وجاہت، سادگی، علم، عمل، دیانت، امانت، شرافت، عبادت، ریاضت، خلوص، محبت، ایثار، ہمدردی اور سب سے بڑھ کر جذبۂ احرار، ہر صفت روشن چمکدار، آدمی سوچ کی گہرائیوں میں ڈوب کر بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کتنی بڑی قدرت والا ہے۔ وہ چاہے تو ایسے دور میں بھی اتنا عظیم انسان پیدا کرنے پر قادر ہے۔

میں نے انہیں سب سے پہلے مارچ ۱۹۴۹ء میں احرار کی دفاع کانفرنس لاہور کے موقع پر جلوس میں ملتان کے رضاکاروں کے جیش کے آگے پریڈ کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ ان کا آغاز شباب تھا۔ احرار یونیفارم میں چمکتا دمکتا نورانی چہرہ ہر دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچتا نظر آیا۔ میں نے ان کی ایک ہی جھلک میں سمجھ لیا کہ یہ کوئی غیر معمولی شخصیت ہے۔ ساتھ والے سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ تو اس نے مجھے بتایا کہ شاہ جی رحمہ اللہ کے سب سے بڑے بیٹے سید عطاء المنعم بخاری ہیں۔

دوسری مرتبہ انہیں چنیوٹ میں دسمبر ۱۹۵۲ء کی سالانہ احرار کانفرنس کے موقعہ پر دیکھا ہی نہیں بلکہ انہیں تقریر کرتے ہوئے سنا۔ تقریر کیا تھی علوم درخشاں کا بہتا چناب، جس کا ہر حرف غیرت ملی کا جیتا جاگتا ثبوت۔ بیاں میں بلا کی کشش، زبان پر الفاظ و معنی کا دلکش نزول۔ بے تکان بولے جا رہے تھے۔ روانی اور تسلسل اپنے نقطۂ کمال کو چھو رہی تھی، جیسے علم و فضل کی کوئی کتاب انکے سامنے کھلی ہے اور وہ پڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ لوگ ان کی تقریر پر جھوم رہے تھے اور کہہ رہے تھے دیکھا یہ ہیں امیر شریعت رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند سید ابوذر بخاری۔

تیسری مرتبہ انہیں اگست ۱۹۶۱ء میں امیر شریعت رحمہ اللہ کی رحلت اور تجہیز و تکفین کے موقع پر صبر و استقامت کا پہاڑ بنے ہر قسم کے انتظام و انصرام میں مصروف و منہمک دیکھا۔ جس کے بعد اکتوبر ۱۹۶۲ء میں جب میری تعیناتی گورنمنٹ کالج سول لائن ملتان میں ہوئی تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلۂ لامتناہی ان کے اس جہان فانی سے رخصت ہونے تک جاری رہا۔ وہ بے پناہ خوبیوں کے مالک انسان تھے۔ علم و فضل کی بلندیاں قدرت کاملہ کے فضل و کرم سے ان کی دسترس میں تھیں۔ بڑے سے بڑا علمی مسئلہ ان کے سامنے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ جس شخص نے چالیس سال کی عمر تک سوائے مطالعے کے اور کوئی کام ہی نہ کیا ہو

اس کے علم اور مطالعہ کا اندازہ کیسے لگایا جا سکتا ہے؟ فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی کوئی نئی کتاب میرے سامنے آتی ہے تو میں کتاب کو لیکر اپنے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیتا پھر اس کتاب کو ختم کئے بغیر باہر نکلنا تو کجا کھانا پینا بھی بھول جاتا تھا۔ جب تک کتاب ختم نہ ہوتی باہر نہیں نکلتا تھا۔ مطالعہ تو سبھی اہل علم حضرات حسب استطاعت کرتے ہی ہیں لیکن مطالعے کا یہ انداز بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ عربی کتب کی عبارتیں انہیں از بر تھیں جنہیں وہ اپنی تقریر اور تحریر کے دوران اس طرح لوگوں کے سامنے بیان کرتے کہ سننے والاان کی ذہانت اور حافظہ کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا۔

ایک دفعہ مجھے انہوں نے بیان کیا کہ ایک کتاب سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر میرے ہتھے چڑھ گئی تو میں حسب عادت اسے لیکر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مطالعہ میں مصروف تھا۔ اماں جی نے پہلے تو ناشتہ کے لئے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اندر سے جواب نہ پا کر خاموش ہو گئیں پھر دوپہر کے کھانے کے لئے بھی اماں جی دستک دیتی رہیں لیکن میں نے اندر سے دروازہ نہیں کھولا اتفاق سے اباجی گھر پر موجود تھے جو یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ بڑے غصے میں آ کر انہوں نے دروازے پر آ کر دستک دی اور کہا حافظ جی یہ اندر کیا ہو رہا ہے، یہ کیا تماشہ ہے، دروازہ کیوں نہیں کھولتے؟ میں نے اباجی کی آواز سنی تو مارے خوف کے کتاب ہاتھ میں لئے دروازہ کھول دیا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا

" یہ آپ کے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پڑھ رہا ہوں اگر یہی امیر معاویہ ہیں۔ جو اس کتاب میں تحریر ہے تو معاف کرنا میں تو انہیں نہیں مانتا" مجھے آپ نے بتایا کہ اس وقت تک میں بھی بے علم اور بے خبر مسلمانوں کی طرح سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا تھا اور جب بھی کوئی نئی کتاب ان کے بارے میں پڑھتا تو ان کے بارے میں میرا غلط تاثر اور زیادہ شدید ہو جاتا تھا۔ اباجی میری بات سن کر غصے میں آ گئے اور فرمانے لگے۔

" ہے ناں وہی جاہلوں والی بات، تمہیں کس بے وقوف نے کہہ دیا ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کتابوں میں تلاش کرو؟ تمہیں میں نے قرآن کس لئے پڑھایا تھا؟ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے؟" یہ کہتے ہوئے اباجی نے قرآن پاک کی وہ تمام آیات یکے بعد دیگرے میرے سامنے تلاوت فرمادیں جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقام و مرتبہ کا ذکر موجود ہے اور فرمانے لگے " اب تمہارے سامنے صرف دو راستے ہیں یا تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو صحابہ کی صف سے باہر نکال کے ان کے بارے میں جو چاہو رائے قائم کرلو اور یہ کام تم کیا کرو گے؟ تمہارے ابا سے بھی نہیں ہو سکے گا اور یا پھر جو قرآن کہتا ہے اسے دل و جان سے تسلیم کرتے ہوئے ان کو وہی مقام دو جو دین اسلام میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری صورت ممکن نہیں

ابوذر بخاری فرماتے ہیں کہ اباجی کے یہ چند جملے میرے دل و دماغ کو یوں روشن کر گئے کہ پھر کبھی اندھیرا نہیں چھایا۔ بقول کسے میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اور یہ بھی آپ کی ہی کرامت ہے کہ اس واقعہ کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں جو کتاب بھی پڑھی وہ آپ کے دفاع میں ہی تھی اور یوں

وقت کے ساتھ ساتھ میں امیر معاویہ کے دفاع میں شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ فرمایا کرتے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت کا دفاع صحابہ کے دفاع کا پھاٹک ہے۔ یہ لڑائی یہیں لڑنی چاہیئے۔ ورنہ نہ حضرت علی محفوظ رہیں گے نہ عثمان و عمر و ابوبکر رضی اللہ عنہم ایک مرتبہ بے تکلفی میں، میں نے کہہ دیا کہ یہ آپ کا انداز دفاع کچھ ضرورت سے زیادہ تو شدید نہیں ہوگیا؟ بعض لوگ دبی زبان میں آپ کے بارے میں ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی سروکار نہیں۔ کہنے لگے..........

"پروفیسر صاحب لوگوں کو جو جی میں آتا ہے کہنے دیجئے۔ لوگ کوئی معیار حق تو نہیں ہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ورنہ عقل والے تو بات کو سمجھتے ہیں کہ جو انسان حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دفاع میں اتنا شدید ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو ان سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع مقام پر ہیں کیوں غلط عقائد رکھے گا۔ مجھ سے زیادہ کون بد بخت اور بد نصیب ہوگا اگر [illegible] معاویہ رضی اللہ عنہ کا دفاع کرتے کرتے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ہو جاؤں میں نے کیا مرنا نہیں ہے؟ مجھے اپنی قبر کا خیال ہے۔ میں ان سب باتوں کو جانتا ہوں اور سمجھتا بھی ہوں۔ آپ بھی لوگوں کی پرواہ نہ کیا کریں۔

ایک مرتبہ کراچی کے دورے سے واپس تشریف لائے، ملاقات ہوئی تو کہنے لگے اس دفعہ کراچی میں علامہ محمود احمد عباسی مصنف "خلافت معاویہ و یزید" سے مل کر آرہا ہوں۔ تقریباً اٹھارہ گھنٹے تک ان سے بحث و تمحیص ہوئی ہے۔ میں نے انہیں برملا کہا ہے کہ آپ نے جس مؤقف کا اظہار اپنی کتاب میں کیا ہے وہ اصولی طور پر درست ہے مگر زبان و بیان میں بعض مقامات پر جو شدت اور بے احتیاطی اختیار کی گئی ہے میں اس سے اختلاف کرتا ہوں۔ علامہ محمود احمد عباسی نے اگرچہ اس شدت کے اسباب دلائل کی صورت میں میرے سامنے رکھے مگر میرے اختلاف کو درست تسلیم کیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب دو کتابوں کا تذکرہ زبان زد خاص و عام تھا دوسری کتاب مولانا ابو اعلیٰ مودودی کی خلافت و ملوکیت تھی۔ "خلافت و ملوکیت" کے خلاف تو آپ نے جس انداز سے پورے ملک کے اندر جلسوں کا اہتمام کر کے جواب دیا وہ آپ کا ہی حصہ ہے۔ دلائل و براہین سے آپ نے مولانا کی کتاب کا بطلان ثابت کیا لیکن کمال ہے کہ کہیں بھی ثقاہت کا دامن آپ کے ہاتھ نہیں چھوٹا۔ منفی انداز تنقید کی بجائے مثبت انداز تنقید آپ نے اپنی تقریروں میں برقرار رکھا اور یہ انداز اتنا مؤثر ہوتا کہ سننے والا عش عش کر اٹھتا۔

ایک مرتبہ ان کی محفل میں دونوں کتابوں کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ میں نے عرض کیا شاہ جی، میرے خیال میں مولانا مودودی ہوں یا محمود عباسی، دونوں نے اپنی اپنی مرضی کا مؤقف پہلے اپنے ذہنوں میں متعین کر لیا تھا کہ ہم نے تاریخی حوالوں سے یہ مؤقف ثابت کرنا ہے اور پھر تاریخ کی کتابوں سے وہی حوالے اپنے مؤقف کی حمایت میں لئے جو تائید میں تھے۔ اور جو تردید میں تھے انہیں دانستہ چھوڑ دیا۔ مولانا مودودی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ میں نے امام ابن تیمیہ کی منہاج السنۃ، قاضی ابوبکر ابن عربی کی العواصم من القواصم، اور شاہ عبدالعزیز کی کتاب تحفہ اثنا عشریہ سے دانستہ استفادہ نہیں کیا کیونکہ ان کتابوں کی حیثیت صفائی کے گواہوں کی سی ہے۔ اب بھلا جو جج وکیل صفائی کو سنے بغیر فیصلہ صادر فرما دیتا ہے۔ اسکا تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔ میری

یہ بات سن کر بڑے خوش ہوئے اور میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا اصل معاملہ یہی ہے اس موقعہ پر مجھے لطیفے کی سوجھی اور یہ بات بھی میرے علم میں تھی کہ آپ اچھے لطائف پسند فرماتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو فرمائش کر کے مجھ سے لطیفے سنتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے۔ میں نے کہا شاہ جی یہ تاریخ کیا بلا ہے؟ تاریخ نہ ہوئی رنجیت سنگھ کا باپ ہو گئی کہنے لگے وہ کیسے؟ میں نے عرض کیا

ایک میراثی رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضر ہوا اور مالی امداد کے لئے سوال کرتے ہوئے اسے کہا کہ رات آپ کے والد مجھے خواب میں ملے تھے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ صبح میرے بیٹے کے دربار میں حاضر ہو کر اسے میرے نام سے ایک صد اشرفیوں کا سوال کرنا وہ راجہ بلکہ مہاراجہ ہو گیا ہے۔ تجھے ضرور سو اشرفیاں دے گا۔ رنجیت سنگھ نے فوراً جواب میں کہا کہ ہاں مجھے بھی رات خواب میں وہ ملے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ فلاں میراثی میرے نام سے سو اشرفیاں مانگے گا حالانکہ میں نے اسے نہیں کہا اور اسے سو اشرفیوں کی بجائے سو جوتے رسید کرنا، میراثی نے جواب سن کر کہا انعام و اکرام کی بات تو رہی ایک طرف بہر حال یہ بات تو طے شدہ ہے کہ آپ کے والد محترم بہت جھوٹے ہیں۔ مجھے کچھ کہتے ہیں اور آپ کو کچھ۔ تاریخ نے بھی مولانا مودودی سے کچھ اور کہہ دیا اور محمود عباسی سے کچھ اور۔ اور دونوں اسی بات پر متفق ہیں۔ ہم نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا جو کچھ تاریخ کی کتابوں میں پہلے موجود ہے اسی سے استفادہ کیا ہے۔ میری یہ بات انہیں پسند آئی اور دیر تک اس سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ کہنے لگے۔ ہاں بھائی کچھ ایسی ہی بات ہے جو لوگ حدیث پر تاریخ کو ترجیح دیتے ہیں یونہی ٹھوکر کھاتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک آدمی نے آپ سے پوچھ لیا کہ حضرت اگر آج کسی ولی اللہ کو تلاش کرنا ہو تو اسکی کوئی ایسی نشانی بتلا دیجئے اسکی تلاش آسان ہو جائے۔ فرمانے لگے آخر آپکو کونسا کام ولی اللہ سے پڑ گیا؟ اسے ہنسی مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب وہ نہ ٹلا تو کہنے لگے "آجکل وہ ولی اللہ ہے جس کے گھر میں دین تو ہے دنیا نہیں ہے"۔

انکی زندگی ایک ایسی داستان ہے جو کئی کتابوں پر محیط ہے وہ ایک سراپا صفات شخصیت تھے۔

ایسے لوگ اپنے کردار و عمل کی صورت میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں مرتے ہرگز نہیں۔ جب تک وہ زندہ رہے جذب و جنون و عشق کا عنوان بنے رہے۔ بڑے بڑے غزالی دوراں ان کے علم و فضل کے سامنے منقار زیر پر ہو جاتے تھے ان کا تبحر علمی ضرب المثل تھا۔ ان کے سینے میں دل اور دل میں ایک درد موجود تھا، وہ خود ہی اس درد کا درماں تھے۔ تمام عمر تقدس صحابہ کے تحفظ کے لئے شعلۂ بُرّاں بنے رہے۔ ان کے عزم و استقلال اور ان کی شرافت و دیانت پر فرشتے بھی رشک کرتے ہوں گے۔ اللہ اللہ کیسا انسان تھا اور کیا کارہائے نمایاں سر انجام دے گیا۔ دشمنوں کے لئے طوفانِ بے پناہ اور اپنوں کے لئے کشتۂ مہر و وفا، انہوں نے اپنے لئے خود کٹھن راہیں چن لی تھیں جن پر وہ بڑے حوصلے سے رواں دواں رہے۔ جنہیں کھلے پانیوں میں موجِ حوادث سے کھیلنے کا شوق ہوتا ہے انہیں ساحلوں سے کہاں لگاؤ رہتا ہے۔ سکون ان کے لئے موت اور اضطراب زندگی بن جاتا ہے۔ اپنے موقف کی صداقت پر یقین، انہیں لازوال اعتماد کی دولت سے مالا مال کر گیا تھا۔ ان کا

ضمیر مطمئن تھا کہ وہ راہِ صداقت پر گامزن ہیں اور جن کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے وہ پوری دنیا سے جنگ لڑ جاتے ہیں۔ وہ گم کردہ راہ مسافروں کے لئے منزل کا نشان تھے۔ ان کا ایک ایک حرف گل پیرہن تھا۔ نورِ ایمانی سے ان کا خیال و سخن دونوں منور تھے۔ ان کے خلوص کی قسمیں کھائی جاسکتی ہیں۔ ان کے لب جب بھی تلاوت فشاں ہوتے سرو سمن وجد میں آجاتے۔ ان کے پیار کی خوشبو نس نس میں مہک اٹھتی ہے ان کے خیال سے ہی صحرائے زیست گلاب و نسترن بن جاتا ہے۔ ان کے لفظوں کی چاندنی کہکشاں بنی رہی، ان کی شیریں سخنی کانوں میں رس گھولتی رہی، وہ بلاشبہ صدق، مہرووفا، جذب و عشق کا استعارہ ہیں۔ وہ مال و دولت سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سکون قلب کی وافر دولت عطاء کر رکھی تھی۔ ان کے مسلک میں عرض و طلب گناہ ٹھہری۔ ان کی نگاہ کی کرنوں کی ضوفشانی نے کئی بے کمال لوگوں کو حسن کمال عطاء کیا۔ ان کی قربت میں فنا ہو کر بھی ایک عجیب لطف محسوس ہوتا تھا۔ ان کا صدق جنوں کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ان کے اس جنوں میں نہ جانے کیا کیا مستیاں رقص فرما رہتی تھیں۔ انہوں نے تمام عمر فقرِ بوذری میں بسر کی۔ ان کی بہار زیست انکے اپنے دل کی شادابی تھی۔ ان کے وجود کو اللہ نے اپنی رحمتوں سے معراجِ بندگی سے نوازا تھا۔ ان کی جبین عجز پر فقر و مستی کے نشان ہویدا تھے۔ ان کا ظاہری حسن، باطنی حسن سے تابناک تھا۔ وہ ایسے درویش خدامست تھے کہ جن کی آستینوں میں تابشِ مہر و ماہ، پاؤں کی ٹھوکر میں سطوتِ کج کلاہ، لب پر ضربِ لاالٰہ ہوتی ہے۔

آج ان کی موت پر آنکھیں ہی نہیں دل بھی روتے ہیں اور غالب کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔

ڈھونڈے ہے اس مغنّی آتش نفس کو جی
جسکی صدا ہو شعلۂ برقِ فنا مجھے

اپنے عطیات اور زکواۃ و صدقات **مدرسہ معمورہ** ملتان

کو عنایت فرمائیں مدرسہ میں رہائش پذیر طلباء کے اخراجات اور نئی درسگاہوں اور رہائشی کمروں کی تعمیر کیلئے اہل خیر حضرات فوراً توجہ فرمائیں

ترسیلِ زر کا پتہ

بذریعہ منی آرڈر: سید عطاء المحسن بخاری۔ دار بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان۔ فون ۵۱۱۹۶۱
بذریعہ بینک: اکاؤنٹ نمبر 29932 حبیب بینک حسین آگاہی ملتان